انواعِ تفسیر

مولانا نور محمد غفاری ایم اے

جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اسی طرح آپ پر اتری ہوئی کتاب یعنی قرآن مجید آخری صحیفہ ہدایت ہے۔ جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے رشد و ہدایت کا مصدر، دنیا و عقبیٰ کی فوز و فلاح کا محور اور خیر و رشد کی پرکھ کی کسوٹی ہے۔ اس کی تعلیمات "تحریکی انداز" رکھتی ہیں۔ یہ اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ جو گوہر گرانمایہ انہوں نے اس سے سمیٹے ہیں۔ انہیں دوسروں میں بھی بانٹیں، جو روشنی انہوں نے حاصل کی ہے۔ اسے لے کر کفر و نفاق کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹکے ہوؤں کے پاس جائیں، جو عدل گستری اور امن پسندی، خیر خواہی اور خیر سگالی، برادری اور بھائی چارگی، مروت اور ہمدردی اور خوش اسلوبی اور حسن معاملگی کے سنہری اصول انہوں نے سیکھے ہیں، وہ انہیں بھی سکھائیں جو جہالت کی تاریکی میں سرگرداں ہیں۔ اور جو طہارت اور پاکیزگی کا درس انہیں قرآن حکیم نے دیا ہے وہ ان کو بھی پڑھائیں جو معاصی کی گندگی میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ درس ابلاغ تھا جو قرآن مجید نے ان مبارک الفاظ میں دیا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران۔ ع۔ ۱۱)	اور تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے کہ خیر کیطرف بلائے اور نیک کاموں کے کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

....

اور اسی پڑھائے ہوئے سبق کا ہر عمل کا ہی نتیجہ تھا کہ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے جہاں مسلمانوں نے دعوت و تبلیغ کے لئے شہروں، علاقوں اور ملکوں میں جماعتیں بھیجیں وہاں مسلمان علماء نے قرآن کے معانی و مطالب کی توضیح و تشریح میں بھی عمریں صرف کر دیں۔ اور آج عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں میں تفاسیر کے جو بیش قیمت مجموعے موجود ہیں وہ ان کی مساعی جمیلہ کے شاہد اور آئینہ دار ہیں۔ یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جتنی محنت و کاوش اور تحقیق و تدقیق مسلمانوں نے قرآن کی شرح و ایضاح میں دکھائی

اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

خواجہ عبدالحی فاروقی سابق پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی تحقیق کے مطابق صرف عربی زبان میں اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں۔ ان کی تعداد کئی ہزار ہے۔ ان میں سے بعض اتنی ضخیم بھی ہیں کہ ان کے اجزاء کی تعداد پانچ سو سے تجاوز کرتی ہے۔ (مثلاً تفسیر حدائق ذات البہجہ)۔

قرآن مجید اپنے معانی و مطالب کے اعتبار سے بحر ناپیدا کنار ہے جس کی تہ میں بے شمار گوہر آبدار پوشیدہ ہیں۔ اور ہر غواص کو کوئی نہ کوئی ایسا موتی ضرور مل جاتا ہے جو اس سے قبل کسی کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آج تک جتنی تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک ہر دوسری تفسیر سے کسی نہ کسی خصوصیت کی بنا پر فائق ہے اور انوکھی کیفیت رکھتی ہے۔

ــــ تفسیر امت مسلمہ کی ادبی اور دینی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ جس کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں آپ کی حیات طیبہ قرآن مجید کی چلتی پھرتی اور منہ بولتی تفسیر تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہؓ نے تفسیر کلام اللہ کی خدمات سرانجام دیں اور ان کی تفسیر زیادہ تفسیر بالروایۃ تھی۔ کیونکہ صحابہؓ سے جو کچھ منقول تھا اسے پوچھنے والوں تک پہنچا دیتے تھے۔ صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا دور آتا ہے۔ یہ لوگ چونکہ صحابہ کرامؓ کے شاگرد تھے۔ لہذا انہوں نے جو تفاسیر لکھیں (یا زبانی بیان کیں) ان میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہؓ کو آیات کی تفسیر میں لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی تفسیر "تفسیر بالماثور" تھی۔ پھر تبع تابعینؒ کے دور میں بھی تفسیر بالماثور کا رجحان غالب رہا۔ اور یہ سلسلہ طبریؒ تک پہنچتا ہے۔ البتہ اسی دوران میں علوم القرآن کی تعداد بڑھتے بڑھتے سو تک پہنچ چکی تھی۔ اور اب ایک مفسر کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ ان تمام علوم کا جامع ہو۔ لہذا طبریؒ کے بعد مفسرین اپنے اپنے فنون میں محدود نظر آتے ہیں۔ اور انہوں نے علوم القرآن مثلاً ناسخ و منسوخ، اسباب نزول، امثال القرآن، اعجاز القرآن، محکم و متشابہ وغیرہ پر بکثرت تالیفات مرتب کیں۔ ان تالیفات کو مرتب کرنے والے چونکہ مختلف مکاتب فکر مثلاً شیعہ، سنی وغیرہ کے علماء تھے، لہذا یہاں اختلاف ضرور تھا۔ مگر کشمکش کا سبب نہ بن سکا۔ ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ادھر دوسری طرف معاشرتی معاشی اور سیاسی حالات بدلتے جا رہے تھے جو اجتہاد کو دعوت دے رہے تھے۔ تیسری طرف اسلامی حکومت تھی جس کی حدود سپین سے لے کر کاشغر تک، اور یمن سے لے کر روم اور شام تک پھیل چکی تھیں اور بعض عجمی اقوام اپنے عجمی افکار اور نظریات کے ساتھ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔ چوتھی طرف یونانی فلسفہ تھا جو سرکاری سرپرستی میں

اپنا اثر جما رہا تھا۔
اگرچہ مندرجہ بالا تمام اسباب نے تفسیر پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن جس چیز نے تفسیر پر گہرے نقوش چھوڑے وہ یونانی فلسفہ تھا جو ایسے تند و تیز سیلاب کی مانند تھا کہ اسلامی افکار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جانا چاہتا تھا۔ اور اسے تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانا کہیئے یا انسانی فطرت کی کمزوری کا نام دیجئے، چڑھتے سورج کی پوجا کے نام سے یاد کیجئے یا امت کے اس گروہ کی بدنصیبی سمجھئے کہ جہاں ایسے راسخ العقیدہ اور مخلص تھے جو اس سیل کو تھامنے کے لئے سیل بن کر آئے وہاں چند انسانوں کا ایک ایسا گروہ بھی تھا جو اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کر دینا ہی باعث فخر سمجھتا تھا۔

فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ۔ ؎ آنچہ عار تست او فخر من است

غرض اس جدید رجحان نے مفسرین حضرات کو تین گروہوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔ ایک طرف تو وہ حضرات تھے۔ جو "تفسیر بالماثورہ" کی روش اختیار کئے ہوئے اور نہایت محتاط واقع ہوئے تھے۔ دوسری طرف متکلمین اسلام تھے جو عقل اور نقل کے سنگھم پر کھڑے تھے۔ اور تیسری طرف یونانی فلسفہ کے متاثرین اور معتقدین تھے۔ جنہیں امت نے "معتزلہ" کا نام دیا۔ یہی وہ لوگ تھے، جنہوں نے "تفسیر بالرائے" کی نیو رکھی اور پوری امت کو نظریاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اس گروہ کے بڑے بڑے وکلاء واصل بن عطا، ابو عبیدہ بن قاسم، جبائی، رمانی اور زمخشری تھے۔ اگرچہ شروع شروع میں اس گروہ نے بہت زور پکڑا اور مسئلہ خلق قرآن کھڑا کر کے علماء امت کو ابتلا میں ڈال دیا۔ مگر الحمدللہ! متکلمین اسلام نے اپنے براہین قاطعہ سے ان لوگوں کو بے دست و پا کر دیا۔ بالآخر یہ فرقہ ختم تو ہو گیا لیکن "تفسیر بالرائے" کی جو روش یہ چھوڑ گیا اس پر کئی گمراہ اشخاص چلے، خود بگڑے، کتنوں کو بگاڑ گئے اور بگاڑ رہے ہیں ؎

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ مانند حرف غلط
لیک اٹھتے بھی تو نقش بیٹھا کے اٹھے

زوال بغداد کے بعد امت پر ادبار آیا، اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی تمام نئی قائم شدہ حکومتیں یورپ کی عیسائی اقوام کے زیر اثر آگئیں جن کے سیاسی نظریات، فلسفیانہ افکار اور تہذیبی رجحانات نے تفسیری ادب کو بھی متاثر کیا۔ چونکہ عیسائی مشنریوں نے اپنا سارا زور عیسائیت کی تبلیغ پر صرف کر دیا۔ اور مسلمان ان کا اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے تو علماء نے ایسی تفاسیر بھی لکھیں جن میں عیسائیت اور دیگر گمراہ فرق کا کھل کر رد کیا۔ مثلاً تفسیر حقانی۔ بعض ایسی تفاسیر لکھی گئیں

جو مغرب زدہ ذہن کی پیداوار ہیں۔ مثلاً "سر سید احمد خان کی تفسیر القرآن۔ بعض ایسی تفاسیر بھی لکھی گئیں جو امت میں زبردست ہیجان اور انتشار کا موجب بنیں۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی جماعت کی تفاسیر۔ بعض تفاسیر سائنس کی روشنی میں مرتب ہوئیں۔ مثلاً علامہ جوہری طنطاویؒ کی تفسیر جواہر القرآن۔

یہاں تک کہ امت کی نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ عالمِ اسلام سے یورپی اقوام کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ مسلمانوں نے علمِ آزادی بلند کیا اور یکے بعد دیگرے تمام اسلامی ممالک طاغوتی طاقتوں کے غاصبانہ قبضہ سے آزاد ہو گئے۔ البتہ ذہنی غلامی بدستور ہے۔ اور یہ ان کے سیاسی، معاشی اور تمدنی نظریات کا قبول کرنا ہے۔ اس ذہنی اسیری کو ختم کرنے اور اسلام کو بحیثیت مکمل ضابطہ حیات تسلیم کرانے کے لئے مفسرین نے ایسی تفاسیر لکھی ہیں جنہیں "تحریکی" کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً سید قطب کی "فی ظلال القرآن"۔

ان سب کے ساتھ ساتھ ایک گروہ ایسا تھا جو نہ تو ذہنی پراگندگی کا شکار تھا۔ اور نہ فلسفہ سے مرعوب، نہ سائنسی ترقی نے انہیں حیرت میں ڈالا۔ اور نہ بدلتے ہوئے حالات انہیں اپنی جگہ سے ہلا سکے۔ ان کا اپنا الگ نہج تھا جس پر وہ قرآن کی تفسیر کرتے تھے۔ یہ گروہ متصوفہ کا تھا۔ اس گروہ کی نمایاں شخصیتیں ابن العربیؒ ابو محمد سہل بن عبداللہ تستریؒ متوفی ۲۸۳ھ ہیں۔ بعض نے اسی گروہ کو باطنیہ کا نام دیا ہے۔

علاوہ ازیں، خوارج، روافض، اسماعیلی، جبریہ، قدریہ اور جہمیہ وغیرہ مستقل الگ فرقے تھے جنہوں نے تفسیر پر دیرپا اثر چھوڑے ہیں۔

الغرض، اس تاریخی تعارف کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج تک قرآنِ حکیم کی جتنی تفاسیر لکھی گئی ہیں۔ انہیں تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ تفسیر بالماثور۔ ۲۔ تفسیر بالرائے۔ ۳۔ تفسیر یا تاویلِ صحیحہ۔

۱۔ تفسیر بالماثور: ماثور کا مادہ اثر ہے۔ اثر کے معنی ہیں، نشان، نقشِ پا وغیرہ۔ ماثور ایسے طریقہ یا راستے یا نشان کو کہتے ہیں۔ جو بار بار اختیار کیا گیا ہو۔ اس کے دوسرے معنی کسی کے نقشِ قدم پر چلنا کے ہیں۔ لہٰذا تفسیر بالماثور ایسی تفسیر کو کہتے ہیں جو دوسروں کے اختیار کئے ہوئے طریقہ پر کی جائے۔

اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر بالماثور اس تفسیر کو کہتے ہیں جس میں قرآنِ پاک کے معنی اور مفہوم کے تعین میں اصل انحصار احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر کیا جاتا ہے۔

۲۔ تاریخی ارتقاء | اس طریقہ تفسیر کا آغاز اگرچہ حضرات صحابہؓ کے زمانے میں ہوا تھا۔ مگر تابعینؒ کے دور میں اس کی زیادہ ترقی ہوئی۔ تابعینؒ نے تفسیری احادیث کے ساتھ ساتھ اقوالِ صحابہؓ کو بھی اکٹھا کر دیا اور صحیح معنوں میں "تفسیر بالماثورہ" کی ابتدا کی۔ اگرچہ بعد کے ادوار میں فلسفہ، سائنس اور وسعت سلطنت کی بنا پر واقع ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے تفسیر بالماثور پر اکتفا کرنا کافی نہ سمجھا گیا۔ اور بہت سے دیگر علوم کو اپنایا گیا مگر بعض ایسے مفسّرین بھی تھے، جنہوں نے تابعینؒ کے بعد کے زمانے میں بھی ایسی تفاسیر مرتب کیں جنہیں "تفسیر بالماثور" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ استاد امین خولی کی تحقیق کے مطابق کتب ماثورہ کا اثر تیسری صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا ہے۔

(بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد ۲ "بیان تفسیر")

۳۔ تفسیر بالماثورہ کی چند شرائط :۔

ا۔ تعبیر کی شستگی

ب۔ روایات کی چھان پھٹک کی جائے۔

ج۔ اور اسانید کا ذکر کرنے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔

۴۔ چند تفاسیر بالماثور :۔

ا۔ "جامع البیان فی تفسیر القرآن" مشہور بہ تفسیر طبریؒ

ب۔ "تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباسؓ"

ج۔ "تفسیر القرآن العظیم" مشہور بہ تفسیر ابن کثیرؒ

د۔ "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" از علامہ جلال الدین سیوطیؒ متوفی ۹۱۱ھ

ہ۔ "المحرر الوجیز فی التفسیر الکتاب العزیز" مشہور بہ تفسیر ابن عطیہؒ۔

(استاد امین خولی کے قول کے مطابق یہ تفسیر بھی بالماثورہ ہے۔

یہ صرف ان تفاسیر کے نام ہیں جو دستیاب ہیں۔

۲۔ تفسیر بالرائے | یہ تفسیر کی وہ نوع ہے۔ جو عقل جزئی کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے ــــ اور "اَلحَسَنُ مَا حسنہُ العقل وَالقبیحُ مَا قبحہ العقل" کے محور پر گردش کرتی ہے۔

تفسیر بالرائے اور کلامی تفسیر (جس کا ذکر انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔) میں بنیادی فرق یہ ہے کہ :

ا۔ وہاں عقل دل کی پاسبان رہتی ہے۔ جبکہ تفسیر بالرائے میں دل عقل کا غلام بن جاتا ہے۔

٢۔ کلامی تفسیر میں رائے پر قرآن و سنت اور اقوالِ صحابہؓ کے پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں۔ لہذا یہ رائے شریعت سے ماخوذ ہے اور اسی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے دعا فرمائی تھی۔ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ۔

اور اسی امر کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے قول "اِلَّا فَھْمًا یُؤْتَاہُ الرَّجُلُ فِی الْقُرْآنِ" سے مراد لیا ہے۔

اور تفسیر بالرائے میں رائے پر عقل جزئی کا غلبہ ہوتا ہے۔

٣۔ تفسیر کلامی میں عقل کو چراغِ راہ تو سمجھا گیا ہے۔ تفسیر بالرائے کی طرح منزل نہیں ؎

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

٤۔ تفسیر بالرائے میں عقل معیارِ حق ہے۔ جبکہ کلامی تفاسیر میں عقل حق تک رسائی کے ذرائع میں سے ایک ہے۔

٥۔ تفسیر بالرائے میں پہلے معنی کو خیال میں جما لیا جاتا ہے۔ پھر قرآنی الفاظ کو اپنے سوچے سمجھے معنی پر محمول کر دیا جاتا ہے۔ لیکن تفسیر کلامی میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ قرآن اور عقل میں تطابق کیا جاتا ہے۔ ورنہ قرآنی احکامات کو قبول کر لیا جاتا ہے اور عقل کو اس کی جائز حدود سے تجاوز کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)